

منشی پریم چند

(۱۸۸۰ء - ۱۹۳۶ء)

پریم چند بہترین افسانہ نویس، ناول نگار اور مترجم کے طور پر معروف ہیں۔ ان کا افسانہ ”کفن“ اور ناول ”گودان“ عالمی معیار کی تحریریں ہیں۔ پریم چند نے اردو ادب میں افسانے لکھنے کی بنیاد ڈالی اور مختصر افسانے کو متعارف کرایا۔ ان کے افسانوں اور ناولوں کے انجام عموماً طربہ ہوتے ہیں مگر انھوں نے بعض اہم تحریروں کو المیہ بنا دیا ہے۔ ان کی تحریروں میں آزادی کی شمع روشن رہتی ہے۔ ان کی تحریروں نے معاشرتی زندگی کی اصلاح کے ساتھ ساتھ انگریزی استعمار کی زنجیروں کو توڑنے کا جذبہ بھی پیدا کیا۔ ان کے افسانوں میں عزم و ہمت کی بہت سی داستانیں ملتی ہیں جس کے ذریعے وہ قارئین میں ولولہ، حوصلہ اور جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ ماضی سے حرارت لے کر مستقبل کو تابناک بنا سکیں۔

پریم چند دیہاتی زندگی کے مناظر نہایت عمدگی سے بیان کرتے ہیں۔ استیصالی طبقات کے خلاف ان کی تحریروں میں بے پناہ نفرت ابلتی ہے۔ عام لوگوں سے محبت اور ان کے مسائل و مشکلات ان کی تحریر کا خاص موضوع ہیں۔ ان کی تخلیقات میں عورتوں کی نہایت عمدہ تصویر پیش کی گئی ہے جو زندگی پر مثبت طور سے اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کی وجہ ان کی سوتیلی ماں تھیں جنھوں نے ان کی زندگی کو ایک عمدہ رخ عطا کیا۔ عموماً عورت کو افسانوں میں ایک کھلونے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جس کا مقصد رنگینی بیان اور خرابی ایمان کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ پریم چند نے عورت کے وجود سے احترام، شائستگی، وقار اور تمکنت کی مستحکم روایات کو افسانے میں برت کر دکھایا ہے جس کے باعث ان کے افسانے مؤثر ہو گئے ہیں۔

ان کے افسانے خارجی میلانات، سطحی جذبات اور جنسی بے راہ روی سے بالکل خالی ہیں ان کا قلم اخلاقیات کے تمام قاعدے، ضابطے اور روایات کا امین ہے لیکن پاکیزہ محبت کے نمونے ان کے یہاں پوری طہارت کے ساتھ ملتے ہیں۔ جس میں عریانیت، فحاشی، جنس زدگی کا گزر نہیں ہوتا۔ کیوں کہ وہ مصلح ہیں۔ افسانہ نگاری میں اخلاقیات کا معیار اس طرح برقرار رکھنا نہایت مشکل کام ہے۔ مگر پریم چند نے اسے آسان کر دکھایا۔

۱۸۵۷ء کے بعد غلامی کے جو اثرات برعظیم کی عام زندگی پر مرتب ہوئے اور جو تحریک اس عرصے میں چلیں، ان سب کی عکاسی پریم چند کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔ پریم چند کا مطالعہ اور مشاہدہ اس قدر گہرا اور بسیط ہے کہ ہر طبقے کے تاثرات، ان کی زندگی کے آلام، ان کا کرب اور ان کی زبان، ہر اک کیفیت کو انھوں نے گہرے شعور و ادراک کے ساتھ پیش کیا ہے کہ ہر افسانہ حقیقت کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ پریم چند کی تحریروں کے باعث اردو افسانہ عالمی سطح پر پہنچ کر دوسری زبانوں کے افسانے سے مقابلے کا اہل ہو جاتا ہے۔

زبان و بیان کے لحاظ سے بھی پریم چند ایک منفرد مقام کے حامل ہیں کہ ہر کہانی میں اس کے کرداروں کے لحاظ سے وہی زبان لکھتے ہیں جو اس مقام اور اس ماحول کی ہو سکتی ہے اور اس میں ایسی بے ساختگی اور برجستگی بھی ہوتی ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

”سوزِ وطن“، ”خواب و خیال“، ”فردوسِ خیال“، ”زادِ راہ“، ”پریم پچھسی“، ”پریم بھسی“

وغیرہ ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے چھ ناول بھی شائع ہو چکے ہیں۔

مفت کرم داشتن

پریم چند

اُن دنوں حسن اتفاق سے حاکم ضلع ایک صاحب ذوق بزرگ تھے جنہوں نے تاریخ اور قدیم سکھ جات میں اچھی تفتیش کی ہے۔ خدا جانے کیسے دفتری کاموں سے انہیں ان مشاغل کے لیے فرصت مل جاتی ہے۔ میں نے ان کے کارنامے پڑھے تھے اور ان کا غائبانہ مداح تھا، لیکن ان کی افسری مزید تعلقات میں مانع تھی۔ مجھے یہ تکلف تھا کہ اگر میری جانب سے پیش قدمی ہوئی تو عام تجربے کے مطابق وہ میری حکام ستائی پر محمول کی جائے گی اور میں کسی حالت میں بھی یہ الزام اپنے سر پر نہیں لینا چاہتا تھا۔ میں تو حکام کو دعوتوں اور عام تقریبوں میں مدعو کرنے کا بھی مخالف ہوں اور جب کبھی سنتا ہوں کہ کسی افسر کو رفاہ عام کے جلسے کا صدر بنایا گیا یا کوئی اسکول یا شفا خانہ یا بدھوا آشرم کسی گورنر کے نام سے منسوب ہوا تو برادران وطن کی غلامانہ ذہنیت پر گھنٹوں افسوس کرتا ہوں۔ مگر جب ایک دن حاکم ضلع نے خود میرے نام ایک رقعہ بھیجا کہ ”میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں، کیا آپ میرے بنگلے پر تشریف لانے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے“ تو میں بڑے شش و پنج میں پڑ گیا۔ کیا جواب دوں۔ اپنے دو ایک دوستوں سے مشورہ لیا۔ انہوں نے کہا صاف کہہ دیجیے، مجھے فرصت نہیں۔ وہ حاکم ضلع ہوں گے تو اپنے گھر کے ہوں گے، کوئی سرکاری ضابطے کا کام ہوتا تو آپ کا جانا مناسب تھا لیکن ذاتی ملاقات کے لیے آپ کا جانا آپ کی شان کے خلاف ہے۔ آخر وہ خود آپ کے مکان پر کیوں نہیں آئے۔ اس سے کیا ان کی شان میں بڑے لگا جاتا تھا۔ اسی لیے تو خود نہیں آئے اور آپ کو بلایا کہ وہ حاکم ضلع ہیں۔ ان احمق ہندوستانیوں کو کبھی یہ سمجھ نہ آئے گی کہ دفتر کے باہر وہ بھی ویسے ہی انسان ہیں جیسے ہم یا آپ۔ شاید یہ لوگ اپنی بیوی سے بھی افسری جتاتے ہوں گے۔ انہیں اپنا عہدہ کبھی نہیں بھولتا۔

۱۔ مفت کا احسان کرنا یعنی مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے۔

ایک صاحب نے جو لطیفوں کے خزانچی ہیں، ہندوستانی افسروں کے کئی پُر مذاق تذکرے سنائے۔ ایک افسر صاحب سسرال گئے شاید بیوی کو رخصت کرانا تھا۔ جیسا عام رواج ہے خسر صاحب نے اس موقع پر رخصت کرنے سے انکار کیا۔ کہا ”بیٹا! ابھی اتنے دنوں کے بعد آئی ہے، تین مہینے بھی نہیں ہوئے بھلا اور نہیں تو چھ مہینے تو رہنے دو“۔ ادھر بیوی نے بھی نائن کے ذریعے پیغام کہلا بھیجا ”ابھی میں جانا نہیں چاہتی۔ آخر ماں باپ سے مجھے بھی تو محبت ہے کچھ تمہارے ہاتھ بک تھوڑے ہی گئی ہوں“۔ میاں داماد ڈپٹی کلکٹر تھے۔ جامے سے باہر ہو گئے۔ خسر پر سمن جاری کر دیا۔ بیچارہ بڈھا آدمی دوسرے دن صاحبزادی کو لے کر داماد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تب جا کے اس کی جان بچی۔ یہ لوگ خر دماغ ہوتے ہیں اور تمہیں حاکم ضلع سے لینا کیا ہے۔ اگر تم کوئی باغیانہ یا اشتعال انگیز قصہ یا مضمون لکھو گے فوراً گرفتار ہو جاؤ گے۔ مطلق رعایت نہ کی جائے گی۔ اپنے لڑکے کے لیے قانون گوئی یا نائب تحصیل داری کی فکر تمہیں ہے نہیں۔ پھر خواہ مخواہ کیوں دوڑے جاؤ۔

لیکن میں نے دوستوں کی صلاح پر کار پیرا ہونا تہذیب کے خلاف سمجھا۔ ایک شریف آدمی قدر افزائی کرتا ہے تو اس سے محض اس بنا پر بے اعتنائی کرنا کہ وہ حاکم ضلع ہے، تنگ ظرفی ہے۔ بے شک حاکم ضلع صاحب میرے غریب خانے پر آتے تو ان کی شان کم نہ ہوتی، وضع دار آدمی بے تکلف چلا آتا۔ لیکن بھی ضلع کی افسری بڑی چیز ہے اور قصہ نگار کی ہستی ہی کیا ہے۔ انگلینڈ یا امریکہ میں افسانہ نگاروں کی میز پر مدعو ہونے میں وزیراعظم بھی اپنا اعزاز سمجھتے ہوں گے لیکن یہ ہندوستان ہے، جہاں ہر ایک رئیس کے دربار میں شاعروں کا ایک انبوہ قصیدہ خوانی کے لیے جمع رہتا تھا اور اب بھی تاج پوشی کے موقع پر ہمارے اہل قلم بن بلائے رئیسوں کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، قصیدے پیش کرتے ہیں انعام پاتے ہیں، تو تم ایسے کہاں کے وہ ہو کہ حاکم ضلع تمہارے گھر پر چلا آئے۔ وہ افسر ہے، تم معمولی مضمون نگار ہو۔ جب تم میں اس قدر اکڑ پن اور تنگ مزاجی ہے تو وہ پھر ضلع کا بادشاہ ہے۔ اگر اسے غرور بھی ہو تو جائز ہے۔ کمزوری کہو، حماقت کہو، خرد مافی کہو، لیکن پھر بھی جائز ہے اور خدا کا شکر کرو کہ افسر صاحب تمہارے گھر نہیں آئے ورنہ ان کی خاطر و مدارات کا سامان تمہارے یہاں کہاں تھا۔ گیت کی ایک کرسی بھی تو نہیں ہے۔ تین پیسے کی چوبیس بیڑیاں پی کر دل

خوش کر لیتے ہو، ہے تو فیتق روپے کے دو سگار پینے کی؟ کہاں وہ سگار ملتا ہے۔ اس کا کیا نام ہے اس کی خبر ہے تمہیں! اپنی نقدیر کو سراہو کہ وہ خود نہیں آئے، تمہیں بلایا۔ چار پانچ روپے بگڑ ہی جاتے اور شرمندگی بھی ہوتی۔ خدا نخواستہ اور تمہاری شامت اعمال سے کہیں ان کی اہلیہ بھی ہمراہ ہوتیں تو قیامت ہی آ جاتی، ان کی مہمان نوازی تم یا تمہاری دھرم پتی جی کر سکتی تھیں؟ وہ تمہارے گھر میں یقیناً آتیں اور تمہارے لیے موت کا سامان ہوتا۔ تم اپنے گھر میں پھٹے پرانے پہن کر اپنی بے نوائی میں مگن رہ کر زندگی بسر کر سکتے ہو، لیکن کوئی بھی خود دار شخص یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کی خستہ حالی دوسروں کے لیے مایہ تفریح ہو۔ ان لیڈی صاحب کے سامنے تمہاری تو زبان بند ہو جاتی اور یہی جی چاہتا کہ زمین پھٹ جاتی اور تم اس میں سما جاتے۔

چناں چہ میں نے حاکم ضلع کی دعوت قبول کی اور باوجود یہ کہ اس میں کسی قدر ناگوار رعونت تھی، لیکن شفقت اور خلوص نے اسے ظاہر نہ ہونے دیا۔ کم سے کم انھوں نے مجھے شکایت کا موقع نہ دیا۔ افسرانہ فطرت کو تبدیل کرنا ان کے امکان سے باہر تھا۔

میں نے سوچا یہ ذاتی معاملہ ہے۔ انھوں نے مجھے بلایا میں چلا گیا کچھ ادبی گپ شپ کی اور واپس آیا کسی سے اس کا ذکر کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ میں نے اس واقعے کو ذرا اہمیت نہ دی گویا بازار سبزی خریدنے گیا تھا۔

لیکن مخبروں نے جانے کیسے اس کی خبر لگائی۔ خاص خاص حلقوں میں یہ چرچے ہونے لگے کہ افسر ضلع سے میرے بہت دوستانہ تعلقات ہیں اور وہ میری بڑی عزت کرتے ہیں۔ مبالغے نے میری وقعت میں اور بھی اضافہ کر دیا یہاں تک مشہور ہوا کہ وہ مجھ سے صلاح لیے بغیر کوئی تجویز یا رپورٹ نہیں لکھتے۔

کوئی ذی ہوش آدمی اس قسم کی شہرت سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ اہل غرض باؤلے ہوتے ہیں، تنکے کا سہارا ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ انھیں اس کا یقین دلانا کچھ مشکل نہ تھا کہ میرے ذریعے ان کی مطلب برآری ہو سکتی ہے۔ لیکن میں ایسی حرکتوں کو ذلیل سمجھتا ہوں۔ صد ہا اصحاب اپنی اپنی داستانیں لے کر میرے پاس آئے کسی کے ساتھ پولیس نے بے جا زیادتی کی تھی، کوئی انکم ٹیکس

والوں کی سختیوں سے نالاں تھا۔ کسی کو یہ شکایت تھی کہ دفتر میں اس کی حق تلفی ہو رہی ہے اور اس کے بعد کے آدمیوں کو تر قیاں مل رہی ہیں۔ اس کا نمبر جب آتا ہے کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا۔ علیٰ ہذا اس قسم کی کوئی نہ کوئی داستان روز ہی مجھ تک پہنچنے لگی لیکن میرے پاس ان سب کے لیے ایک ہی جواب تھا ”مجھ سے کوئی مطلب نہیں۔“

ایک دن میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ میرے بچپن کے ایک ہم جماعت دوست **داخل** وارد ہوئے۔ ہم دونوں ایک ہی مکتب میں پڑھنے جایا کرتے تھے۔ کوئی ۴۵ سال کی پرانی بات ہے میری عمر ۸ یا ۹ سال سے زیادہ نہ تھی، وہ بھی قریب قریب اسی عمر کے، مگر مجھ سے کہیں تو انا اور **صوٹا** **لک دیں** **فریبہ** تھے۔ میں ذہین تھا وہ حد درجہ کے **غبی**۔ مولوی صاحب ان سے عاجز تھے اور انھیں سبق صاحب کی قچی جہاں لا چار تھی وہاں میری ہمدردی کامیاب ہو گئی۔ بلد یو چل نکلا اور خالق باری تک آپہنچا مگر اسی درمیان مولوی صاحب کی وفات نے اس مکتب کا خاتمہ کر دیا اور طلبہ بھی منتشر ہو گئے تب سے بلد یو کو میں نے صرف دو تین بار راستے میں دیکھا (میں اب بھی وہی منحنی ہوں وہ **بلا** اب بھی دیو قامت) رام رام ہوئی، ایک دوسرے کی خیر و عافیت پوچھی اور اپنی اپنی راہ چلے گئے۔ میں نے ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا ”آدھنی بلد یو مزے میں تو ہو، کیسے یاد کیا، کیا کرتے ہو آج کل؟“

بلدیو نے دردناک انداز سے کہا، ”زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں اور کیا، تم سے ملنے کا بہت دنوں سے اشتیاق تھا۔ یاد کرو وہ مکتب والی بات جب تم مجھے پڑھایا کرتے تھے۔ تمھاری بدولت چار حرف پڑھ گیا اور اپنی زمینداری کا کام سنبھال لیتا ہوں، نہیں مورکھ بنا رہتا۔ تم میرے **لکھنؤ** گرو ہو بھائی۔ سچ کہتا ہوں مجھ جیسے گدھے کو پڑھانا تمھارا ہی کام تھا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ مولوی صاحب سے سبق پڑھ کر اپنی جگہ پر آیا نہیں کہ بالکل صاف، کچھ سوچتا ہی نہیں تھا۔ تم تو تب بھی بڑے ذہین تھے۔“

یہ کہہ کر انھوں نے مجھے پُر عزت نظروں سے دیکھا۔ میں نے ہانپ کر کہا ”میں تو جب

تمہیں دیکھتا ہوں تو یہی جی میں آتا ہے کہ دوڑ کر تمہارے گلے سے لپٹ جاؤں ۴۵ سال کی مدت گویا بالکل غائب ہو جاتی ہے۔ وہ مکتب آنکھوں کے سامنے پھر نہ لگتا ہے اور بچپن ساری دل فریبوں کے ساتھ تازہ ہو جاتا ہے۔“

بلدیو نے بھی رقت آمیز لہجے میں جواب دیا ”میں نے تو بھی تمہیں ہمیشہ اپنا مری اور رہنا سمجھا ہے۔ جب تمہیں دیکھتا ہوں تو چھاتی گز بھر کی ہو جاتی ہے کہ وہ میرا بچپن کا دوست جاتا ہے جو وقت پڑنے پر کبھی دغانہ دے گا۔ تم کچھ کھاتے پیتے کیوں نہیں؟ سوکتے کیوں جاتے ہو، گھی نہ ملتا ہو تو ایک دو کنستر بھجوا دوں؟ اب تم بوڑھے ہو گئے خوب ڈٹ کر کھایا کرو۔ اب تو بدن میں کچھ طاقت ہے وہ کھانے پینے کی بدولت ہے۔ میں تو اب بھی سیر بھر دودھ اور پاؤ بھر گھی اڑائے جاتا ہوں۔ ادھر تھوڑا مکھن بھی کھانے لگا ہوں۔ عمر بھر بال بچوں کے لیے مرٹے، کوئی پوچھتا ہے تمہاری کیا حالت ہے؟ اگر آج کندھا ڈال دوں تو کوئی ایک لوٹے پانی کو نہ پوچھے اس لیے خوب کھاتا ہوں اور سب سے زیادہ کام کرتا ہوں۔ وہی جو بڑا لڑکا ہے اس پر پولیس نے ایک جھوٹا مقدمہ چلا دیا ہے۔ اچھا خاصا پہلوان ہے کسی سے دبتا نہیں۔ داروغہ جی سے ایک بار کچھ کہا سنی ہو گئی تب سے اس کی گھات میں لگے ہوئے تھے۔ ادھر گاؤں میں ایک ڈاکہ پڑ گیا۔ داروغہ جی نے تحقیقات میں اسے بھی پھانس لیا۔ ایک ہفتے سے حراست میں ہے۔ مقدمہ محمد خلیل صاحب ڈپٹی کلکٹر کے اجلاس میں ہے اور محمد خلیل اور داروغہ جی کی گہری دوستی ہے۔ ضرور سزا ہو جائے گی۔ اب تم ہی بچاؤ تو اس کی جان بچ سکتی ہے، ہمیں اور کوئی امید نہیں ہے۔ سزا تو ہوگی۔ عزت خاک میں مل جائے گی۔ تم جا کر حاکم ضلع سے اتنا کہہ دو کہ مقدمہ جھوٹا ہے، آپ خود تحقیقات کریں۔ بس دیکھو، بچپن کے ساتھی ہو، انکار مت کرنا۔ جانتا ہوں کہ تم ان معاملات میں نہیں پڑتے اور نہ پڑنا چاہیے۔ افسر ضلع سے تمہاری دوسری طرح کی ملاقات ہے۔ تم کیوں ان قضیوں میں پڑو گے، لیکن یہ گھر کا معاملہ ہے اتنا سمجھ لو، اور بالکل جھوٹا ہے۔ مشکلوں نہیں تو میں تمہارے پاس نہ آتا۔ لڑکے کی ماں رو رو کر جان دیے ڈالتی ہے، بیوی نے اپنا دانا پانی چھوڑ رکھا ہے۔ سات دن سے گھر میں چولہا نہیں جلا۔ میں دودھ پی لیتا ہوں لیکن دونوں ساس بہو تو بے آب و دانہ پڑی ہوئی ہیں اگر سزا ہوئی تو دونوں مرجائیں گی۔ میں نے یہی کہہ کر سب کو ڈھارس

دی ہے کہ ”جب تک ہمارا بچپن کا دوست زندہ ہے کوئی ہمارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔“

میں بڑی مشکل میں پڑا۔ میری جانب سے جتنے اعتراضات ہو سکتے تھے ان کا جواب بلدیونگھ نے پہلے ہی دے دیا تھا۔ اگر پھر ان کا اعادہ کرتا ہوں تو یہ سر ہو جائے گا گا نہ چھوڑے گا۔ کوئی جواب نہ سوچا آخر مجھے مجبور ہو کر کہنا پڑا کہ ”میں جا کر صاحب سے اس کا ذکر کروں گا مگر مجھے امید نہیں کہ اس کا کچھ نتیجہ ہو، حکام ماتحتوں کے معاملے میں بہت کم دخل دیا کرتے ہیں۔“

دکھوانا

”تم جا کر کہہ دو، تقدیر میں جو ہے وہ تو ہو گا ہی۔“

”اچھی بات ہے۔“

”کل جاؤ گے“

”کل ہی جاؤں گا۔“

بلدیونگھ کو رخصت کر کے میں نے اپنا مضمون ختم کیا اور آرام سے کھانا کھا کر لینا۔ میں نے بلدیونگھ کو جھانسا دیا تھا۔ میں پہلے سے بتا چکا تھا کہ صاحب عام طور پر پولیس کا اعتبار کرتے ہیں۔ یہ کہنے کی کافی گنجائش تھی کہ صاحب نے اس معاملے میں دخل دینا مناسب نہ سمجھا۔ صاحب کے پاس جانے کا میں نے خواب میں بھی خیال نہیں کیا تھا۔

میں اس واقعے کو بھول گیا تھا کہ آٹھویں دن بلدیونگھ اپنے پہلوان بیٹے کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ بیٹے نے میرے قدموں پر سر رکھ دیا اور ایک کنارے کھڑا ہو گیا۔ بلدیونگھ بولے، ”بالکل بری ہو گیا۔ بھائی، صاحب نے داروغہ جی کو بلا کر خوب ڈانٹا کہ تم بھلے آدمیوں کو ستاتے اور بدنام کرتے ہو۔ اگر پھر ایسی شرارت کی تو برخاست کر دیے جاؤ گے۔ داروغہ بہت پشیمان ہوئے۔ جب صاحب نے اسے بری کر دیا تو میں نے داروغہ صاحب کو جھک کر سلام کیا بیچارے پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ یہ تمہاری سفارش کی برکت ہے برادر، اگر تم نے مدد نہ کی ہوتی تو ہم تباہ ہو گئے تھے۔ یہ سمجھ لو چار آدمیوں کی جان بچ گئی۔ میں تمہارے پاس ڈرتے ڈرتے آیا تھا۔ لوگوں نے کہا تھا کہ ان کے پاس ناحق جاتے ہو۔ وہ بڑا بے مروت آدمی ہے اس کی

ذات سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ آدمی وہ کہلاتا ہے جس سے ضرورت مندوں کا کام نکلے۔ وہ کیا آدمی ہے جو کسی کی بھی سنے ہی نہیں۔ یہی کہے مجھ سے کچھ مطلب نہیں۔ لیکن بھائی میں نے کسی کی نہ سنی میرے دل میں میرا رام بیٹھا کہہ رہا تھا کہ تم چاہے کتنے ہی روکھے اور بے مروت ہو لیکن مجھ پر ضرور رحم کرو گے۔“

یہ کہہ کر بلد یوسنگھ نے اپنے لڑکے کو اشارہ کیا وہ باہر گیا اور ایک بڑا سا گٹھرا اٹھالایا جس میں انواع و اقسام کی دیہاتی سوغاتیں بندھی ہوئی تھیں۔ حالاں کہ میں برابر کہے جاتا تھا ”کوئی ضرورت نہیں، کوئی ضرورت نہیں۔“

مگر اس وقت بھی مجھے یہ تسلیم کرنے کا حوصلہ نہ ہوا کہ میں صاحب کے پاس گیا ہی نہیں جو کچھ ہوا خود بخود ہوا۔ مفت کا احسان چھوڑنا طبیعت نے گوارا نہ کیا۔